چوبیس آنکھیں

ساکائے سُوبوئیؔ

مُترجم اجمل کمال

چوبیس آنکھیں

ساکائے سُو بوئی

مترجم: اجمل کمال

مشعل

آر-بی 5 ، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 ، پاکستان

MashalBooks.com

مصنفہ کا تعارف

جاپانی ناول ''چوبیس آنکھیں'' کی مصنفہ ساکائی سوبُوئی (Sakae Tsuboi) ۱۹۰۰ء میں خشکی سے گھرے سمندر سیتو کے جزیرہ شو دو میں پیدا ہوئیں۔ گریڈ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے جزیرے کے ڈاک گھر اور دیہی مرکز میں کلرک کے طور پر دس برس کام کیا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ٹوکیو منتقل ہوگئیں جہاں شاعر شیگے جی سوبوئی سے ان کی شادی ہوئی۔ وہیں بعد میں وہ جاپانی ناول نگار خواتین، مثلاً یوریکو میاموتو اور اینکو ساتا سے متعارف ہوئیں اور ان کی حوصلہ افزائی کے زیر اثر فکشن میں طبع آزمائی شروع کی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ان کے ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ سوبوئی ایسی کہانیاں سنانے میں خاص مہارت رکھتی ہیں جن کے مرکزی کردار بچے ہوں۔ اس قسم کی کئی تحریروں پر انھیں مختلف اعزاز بھی مل چکے ہیں۔

سوبوئی کا زیر نظر ناول ''چوبیس آنکھیں'' پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور چھپتے ہی مقبول عام ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد فلم ڈائریکٹر کیسو کے کیسو شیتا نے اس ناول پر ایک فلم بنائی جس کا ہر عمر کے ناظرین نے پُر جوش خیر مقدم کیا۔

پیش لفظ

کسی دانا نے امن اور جنگ کا فرق یوں بیان کیا تھا کہ امن کے دنوں میں اپنی طبعی عمر گزار کر مرنے والے باپوں کو اُن کے بیٹے گورستان تک پہنچاتے ہیں جب کہ جنگ کے زمانے میں بوڑھے باپوں کو اپنے جوان بیٹوں کو میّتوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان ہونے والی ہر جنگ نہایت بلند آہنگ قومی اور نظریاتی مقاصد کے دل فریب نعروں کے جلوس میں وارد ہوتی ہے اور ان نعروں کی گونج میں یہ سادہ انسانی حقیقت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ جنگ کا مطلب دونوں طرف کے جوانوں کو زندگی کے امکانات سے محروم کر کے، طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے، موت سے ہم کنار کر دینا ہے۔ جنگ کی بابت جو بنیادی انسانی سوال بار بار اٹھاتے رہنا چاہیے وہ یہ ہے: کیا کوئی قومی یا نظریاتی مقصد اس لائق ہے کہ نوعمر انسانی زندگیوں کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جائے؟

جاپانی خاتون ناول نگار ساکائے سوبوئی (Sakae Tsuboi) نے اپنے ناول ''چوبیس آنکھیں'' میں یہی بنیادی سوال اٹھایا ہے۔ اس ناول کے ایک پُر اثر منظر کا نقش پڑھنے والے کے دل پر بیٹھ جاتا ہے: بندرگاہ پر بنی آرائشی محراب جس کے ایک جانب ''الوادع'' اور دوسری جانب ''خوش آمدید'' کے الفاظ تحریر ہیں اور جہاں زندہ نوعمر انسانوں کو نعروں کی گونج میں بھیجا اور اُن کے مُردہ جسموں کو انھیں نعروں کی گونج میں وصول کیا جاتا ہے۔ رفیع نظریاتی مقاصد اور بلند بانگ قومی دعووں کی دھند درمیان سے ہٹا دیجیے تو جنگ کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے؟

سوبوئی کا یہ ناول، جیسا کہ اس کے انگریزی مترجم آکیرا میورا (Akira

MashalBooks.com

(Miura) کا کہنا ہے، ان عمیق سوالوں سے سروکار رکھتا کہ ''جنگ کیوں ہوتی ہے؟''، ''جنگ کو کیوں کر روکا جا سکتا ہے؟'' اور ''کیا تمام جنگیں بے جواز ہوتی ہیں؟'' یہ سوالات بلاشبہ کسی تخلیقی یا علمی مطالعے کا موضوع بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن سوبوئی نے اپنے ناول میں ایک استانی کی دردمندی سے بارہ کم سن شاگردوں کی زندگی کا مطالعہ کر کے صرف یہ دیکھنا اور دکھانا چاہا ہے کہ جنگ کی مہیب اور غیر انسانی وحشت نے ان انسانی وجودوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ عمیق سوالوں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان سے اس انسان دوست تخلیقی مطالعے کی اہمیت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔

نوخیز نسل کا رُخ زندگی کی نیرنگیوں سے موڑ کر اسے جنگ کا ایندھن بننے پر آمادہ کرنے کا عمل ایک سفّاک اور بے درد منصوبہ بندی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس ناول میں اس منصوبہ بندی کی جھلک بڑی خوبی سے اُبھرتی ہے جس کے تحت معصوم ذہنوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قومی تاخیر کی فتح مندی پھولوں، تتلیوں اور انسانی رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ ہر جنگ اپنے بنیادی مفہوم، یعنی انسانوں کے قتل، میں دراصل فطرت کے خلاف جنگ ہے، اس لیے جنگی جنون پیدا کرنے والے پروپیگنڈے کا ایک ناگزیر پہلو حقائق کی پردہ پوشی بھی ہوتا ہے۔ حقائق کی روشنی سے محروم ہو کر یہ نوخیز ذہن اس مطلوبہ حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ انھیں تعصّب اور نفرت کی دھند میں لپیٹ کر ماؤف کیا جا سکے اور وہ اپنے نوجوان جسموں کو جنگ کی آگ کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

اس ناول کے واقعات دوسری جنگِ عظیم سے قبل، دوران اور بعد کے تاریخی حقائق کے پسِ منظر میں رونما ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا سیاق و سباق ۱۹۳۰-۴۰ کی دہائیوں کا جاپان ہے۔ لیکن اس ناول کی کامیابی یہ ہے کہ یہ اپنے فوری سیاق و سباق کا اسیر نہیں رہتا بلکہ اس میں بیان کی گئی انسانی سچائیوں کو ہم اپنے اردگرد بھی، اور آج بھی، دریافت کر سکتے ہیں۔ یہی اس کے اردو ترجمے کی اشاعت کا جواز ہے۔

اجمل کمال
کراچی
۲۵ جولائی ۱۹۹۵

MashalBooks.com

مس اوئیشی کے بارہ شاگردوں کے نام

لڑکیاں

کوتسوروکابے: ''گھنٹی والے'' کی باتونی بیٹی۔

ماسونوکاتاگیری: ریستوراں کے مالک کی بیٹی جو موسیقی کا ذوق اور صلاحیت رکھتی تھی

کوتولے کاتاگیری: ایک ماہی گیر کی بیٹی۔

ماتسوائے (ماتچان) کاواموتو: بڑھئی کی بیٹی۔

فوجیکو کیسوشیتا: ایک قدیم معزز گھرانے کی بیٹی۔

میساکو (مائیسان) نیشی گوچی: ایک خوش حال گھرانے کی بیٹی۔

سانائے یاماایشی: ایک شرمیلی مگر ذہین لڑکی۔

MashalBooks.com

لڑکے

نیتا آئزاوا: اونچی آواز والا ایک باتونی لڑکا۔

ایسوکیچی (سونکی) اوکادا: دہی پھلیاں بیچنے والے کا لڑکا۔

تاداشی (تانکو) موری اوکا: ماہی گیروں کے سردار کا بیٹا۔

تاکےاچی تاکے شِیتا: چاول کے تاجر کا ذہین بیٹا۔

کیچی جی (کچّن) توکودا: ایک خاموش طبع لڑکا۔

MashalBooks.com

مس کوئیشی

اگر، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک پیڑھی کی عمر بیس سال ہوتی ہے، تو اس کہانی کی ابتدا ایک پیڑھی سے کچھ زیادہ پُرانی ہے۔ اُس زمانے کے یادگار واقعات کا ذکر کیا جائے تو وہ یہ تھے کہ انتخابی نظام نیا نیا تبدیل ہوا تھا، اور ہر ایک کو ووٹ کا حق دینے والے نئے قانون کے تحت پہلے انتخابات فروری میں ہوئے تھے۔ ان انتخابات کے دو مہینے بعد، اپریل ۱۹۲۸ کی چار تاریخ کو، خشکی سے گھرے سمندر کے پاس واقع کسانوں اور ماہی گیروں کے ایک معمولی سے گاؤں میں ایک نوجوان عورت اسکول میں استانی ہو کر پہنچی۔

گاؤں میں سو سے کچھ اوپر گھر آباد تھے اور وہ ایک لمبی سی پتلی راس کی بالکل نوک پر واقع تھا؛ خشکی کی اس نوک دار پٹی کی وجہ سے کھاڑی کچھ کچھ جھیل جیسی لگتی تھی۔ چنانچہ گاؤں والوں کو کھاڑی کے دوسری طرف واقع کسی قصبے یا گاؤں میں جانا ہوتا تو یا تو چپوؤں والی کشتی کھَے کر جاتے یا پہاڑی پگڈنڈیوں میں سے پیدل لمبا فاصلہ طے کر کے جانا پڑتا۔

چوں کہ گاؤں اس قدر دور اُفتادہ تھا اس لیے وہاں کے پرائمری اسکول جانے والے بچے پہلی چار کلاسیں اِسی گاؤں کے اسکول میں پڑھتے جو دراصل ایک اسکول کی ذیلی شاخ تھی۔ پانچویں میں پہنچنے پر انھیں تین میل دور بڑے گاؤں کے اسکول میں جانے کی اجازت ملتی۔ اُن کی ہاتھ کی بنی تنکوں کی چپلیں دن بھر کے چلنے پھرنے سے برابر ہو جاتیں لیکن بچوں کو اس بات پر ناز ہوتا۔ ہر صبح چپلوں کی نئی جوڑی پانے پر انھیں کیسی خوشی ہوتی ہوگی! پانچویں تک پہنچتے پہنچتے وہ خود بھی تنکوں کی چپلیں بنانا سیکھ چکے ہوتے تھے۔ ہر اتوار کو چپلیں بنانے کے لیے گھروں سے تنکے جمع کرنے کا الگ مزہ تھا۔ ان بڑے بچوں کو رشک سے تکتے تکتے چھوٹی عمر کے بچے، کسی شاگردی کے بغیر ہی، خود بخود یہ ہنر سیکھ جاتے۔ چھوٹے بچوں کے لیے پانچویں تک پہنچ جانے کا مطلب تھا اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانا۔ مگر اس کے باوجود، گاؤں کے اپنے اسکول کی زندگی بھی مزے سے خالی نہ تھی۔

MashalBooks.com

ذیلی اسکول میں دو پڑھانے والے ہمیشہ موجود ہوتے تھے: ایک سِن رسیدہ استاد اور ایک نوجوان استانی۔ اس معمول میں بہت طویل عرصے سے فرق نہیں آیا تھا، جیسے یہ کوئی طے شدہ ضابطہ ہو۔ معمر استاد رات کو سٹاف روم کے برابر والے کمرے میں رہتا جب کہ نوجوان استانی روز صبح لمبا راستہ طے کر کے اسکول پہنچا کرتی۔ استاد تیسری اور چوتھی کلاس کو پڑھاتا، استانی پہلی اور دوسری کو۔ یہ سب مدتوں سے اسی طرح چلا آ رہا تھا۔ بچے ان دونوں کو نام سے نہیں بلکہ ماسٹر صاحب اور استانی صاحبہ کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ معمر استاد، ریٹائر ہو کر پنشن پانے کی امید میں، ٹکے رہتے تھے مگر نوجوان استانیاں سال بھر میں، یا بہت سے بہت دو سال میں، رخصت ہو جاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ راس کے گاؤں کا ذیلی اسکول ایک ایسا مقام ہے جہاں عمر رسیدہ استاد، جنھیں پرنسپلی کے عہدے تک پہنچنے کی امید نہ رہی ہو، اپنی ملازمت کے باقی ماندہ ایّام گزارتے ہیں، اور نئی، ناتجربہ کار استانیاں تدریس کا پہلا، دشوار تجربہ حاصل کرتی ہیں۔

آیئے، اب اپریل ۱۹۲۸ کی چار تاریخ پر واپس چلتے ہیں۔ اس روز، صبح سویرے،، گاؤں کے پانچویں اور اس سے اوپر کی کلاسوں کے بچے خوشی خوشی اپنے تین میل لمبے سفر پر بڑھ جا رہے تھے۔ وہ سب اونچی کلاسوں میں پہنچ جانے پر اتنے خوش تھے کہ ان کے قدم زمین پر ہلکے پڑ رہے تھے۔ ان کے بستوں میں نئی کتابیں رکھی تھیں اور نئی کلاسوں میں نئے استادوں سے پڑھنے کی امید میں انھیں یوں لگتا تھا جیسے وہ نئے راستوں پر چل رہے ہوں۔ اس کے علاوہ آج اسی راستے پر ان کی ملاقات نئی استانی سے ہونے والی تھی جو گاؤں کے اسکول میں پہلی بار پڑھانے آ رہی تھی۔

''کیسی چھوکری ہو گی نئی استانی؟'' بڑے اسکول کے لڑکوں میں سے ایک نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ قریب قریب اتنی عمر کا ہو گا جیسے آج کل کے جونیئر ہائی اسکول کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بدتمیزی کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔

''کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ نئی والی ابھی ابھی گرلز ہائی اسکول سے نکلی ہے۔''

''پھر تو بالکل کچی ہو گی، کیوں؟''

''ہاں، ہمارے گاؤں میں تو کچی استانیاں ہی آتی ہیں۔''

''چھوٹے گاؤں میں تو اسی طرح گزارا کرنا پڑتا ہے۔''

گرلز اسکول سے نکلی استانیوں کو، جنھوں نے باقاعدہ ٹیچرز کالج کا منہ نہ دیکھا

ہو، گاؤں کے منہ پھٹ لوگ کچی استانیاں کہا کرتے تھے۔ آج کل کی زبان میں انھیں شاید اسسٹنٹ ٹیچر کہا جائے گا۔ یہ لڑکے اُنھیں منہ پھٹ بڑوں کی زبان میں باتیں کر کے خود کو بڑا محسوس کر رہے تھے۔ البتہ ان میں سے جو تازہ تازہ پانچویں میں پہنچے تھے اور آج پہلی بار بڑے اسکول جا رہے تھے، حیرت سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر چپ چاپ سن رہے تھے، جیسا کہ ٹولی میں نئے شامل ہونے والوں کا قاعدہ ہے۔ مگر جب گاؤں کی طرف آتی ہوئی شبیہ دکھائی دی تو اِنھیں پانچویں کلاس والوں نے سب سے پہلے مسرت کی چیخیں بلند کیں۔

''ہرآ! استانی صاحبہ آگئیں!''

یہ مس کوبایاشی تھیں جو ابھی کچھ دن پہلے تک گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ عموماً وہ پاس سے گزرتے بچوں کے آداب کا جواب رکے بغیر ذرا سا سر ہلا کر دیا کرتی تھیں لیکن آج رک گئیں اور ایک ایک کے چہرے کو شفقت سے دیکھنے لگیں۔

''آج واقعی آخری دن ہے۔ آج کے بعد شاید ہم اس راستے پر نہیں ملیں گے۔ مجھے امید ہے تم لوگ اچھے شاگرد ثابت ہو گے۔''

ٹولی میں شامل کچھ لڑکیوں کا دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ مس کوبایاشی ایک استانی کی جگہ عارضی طور پر آئی تھیں جو بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ لیکن پہلے کی تمام استانیوں کے برعکس وہ گاؤں کے اسکول میں پورے ساڑھے تین برس ٹھہریں۔ اس طرح آج راستے میں جن بچوں سے اُن کی ملاقات ہوئی وہ سب کے سب ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ قاعدے کی رو سے اسکول کے عملے میں کسی تبدیلی کا اعلان نئے سال کے پہلے دن کیا جاتا تھا، مگر مس کوبایاشی نے روایت سے روگردانی کرتے ہوئے یہ خبر اپنے شاگردوں کو دس دن پہلے ہی دے دی تھی۔ ۲۵ مارچ کو، بڑے اسکول میں چھٹیاں شروع ہونے کی تقریب سے لوٹتے ہوئے وہ سب ان سے اسی جگہ ملے تھے جہاں آج کھڑے تھے۔ مس کوبایاشی نے ان سب کو الوداع کہا تھا اور ہر ایک کو بھوری مٹھائیوں کا ایک ایک ڈبّا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب آج نئی استانی کی آمد کے منتظر تھے۔ انھیں حیرت ہوئی کہ نئی استانی کے بجائے ان کی ملاقات پہلے مس کوبایاشی سے ہوگئی۔ شاید وہ آج گاؤں کے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کو الوداع کہنے جا رہی ہوں گی۔

''مس کوبایاشی، نئی استانی کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے بس آتی ہی ہوں گی۔''